ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم!

# رُومی اور اقبال

چو رومی در حرم دادم اذاں من — از و آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او — بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

اقبال نے ان اشعار میں جو دعویٰ کیا ہے وہ کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت ہے۔ اقوام کو جو ہر قسم کے فتنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں کوئی فتنہ سیاسی ہوتا ہے کوئی علمی یا عقلی اور کوئی فتنہ اخلاقی اور روحانی۔ کسی ملت کی اساسی حیثیت کی استواری کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ وہ کہاں تک ان مختلف اقسام کے زلزلوں سے متزلزل ہو کر پھر اپنا توازن قائم کر سکتی ہے۔

اسلام اپنی چودہ سو سال کی تاریخ میں ہر قسم کے فتنوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ رسول کریم کی وفات کے بعد ہی تمام عرب میں عدم ادائیگی زکوٰۃ کا فتنہ بپا ہوا اور جھوٹی نبوت کے مدعی پھر بڑے بڑے قبائل کو ساتھ ملا کر الحاد پر تل گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسے قوی ارادے والا عظیم الشان انسان بھی کچھ عرصہ کے لئے متذبذب اور متزلزل ہوا، لیکن حضرت ابوبکرؓ صدیق کی بصیرت نے جلد ان کی ہمت بندھا دی۔ اس کے بعد رنگا رنگ کے سیاسی اور عقایدی فتنے بپا ہوتے رہے لیکن اسلامی تہذیب و تمدن و سیاست دنیا پر چھاتی گئی۔ اس کے بعد سب سے زیادہ ملّت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے والا فتنہ فتنۂ تاتار تھا جس کے متعلق اسلام کے ضامن خدا نے یہ معجزہ دکھایا کہ بقول اقبال:

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اقبال نے ان اشعار میں ایک فتنۂ عصرِ کہن کا ذکر کیا ہے جس کو فرو کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے رُومی کو خدا نے ایک خاص وجدان اور ایک خاص انداز بصیرت بخشا تھا۔ رومی

کے زمانہ میں شدید قسم کے سیاسی فتنے بھی موجود تھے لیکن اقبال جس فتنے کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ عقلی، اخلاقی اور روحانی فتنہ ہے۔ رومی کے عہد میں ایک محدود قسم کی یونانی حکما سے اخذ کردہ عقلیت نے اسلامی عقاید کو منطق اور علم الکلام کی ایک چیستاں بنا دیا تھا اور سادہ روحانیت والے لوگ اس سے بیزار ہو کر پکار اٹھتے تھے:

رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عاشقاں جز خدا ہیچ نیست

اسلام بھی انسان کو تدبر اور تفکر اور مظاہر ارض و سمٰوات کا گہرا مطالعہ کرنے کی تلقین کرتا ہے اور عقل کو استعمال نہ کرنے والوں کو جانور بلکہ اس سے کمتر مخلوق گردانتا ہے۔ لیکن جس قسم کی عقل کو قرآنِ کریم استعمال کرنے کی تعلیم دیتا ہے وہ عقل ایسی ہونی چاہیئے جو انفس و آفاق کے وسیع مطالعہ پر مبنی ہو اور غیر ملوث بصیرت سے اس سے صحیح نتائج اخذ ہو سکیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو عقل فقط ظنیات کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے اور اس کھیل میں اس کو لذت ملنی شروع ہو جاتی ہے۔ مولانا روم کے زمانہ میں عقلیات کا ڈھانچہ کچھ اسی انداز کا تھا جو نہ مشاہدۂ فطرت میں معاون ہوتا تھا اور نہ توسیع و تزکیۂ نفس میں۔ اس قسم کی بحثیں کہ کلام الٰہی حادث ہے یا قدیم۔ ذات صفات سے الگ ہے یا اس سے غیر منفک طور پر وابستہ۔ تعدد صفات سے توحید میں شرک پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ خدا ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے یا نہیں اور توحید تمام علائق اور اضافات سے منزہ ہو کر خالص ہوتی ہے یا اضافات اس کا لازمی جزو ہیں۔ اس قسم کی منطقی بحثیں جزوِ دین بن گئی تھیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان بحثوں نے اصل دین کو برطرف کر کے ان کی جگہ لے لی تھی۔ کچھ سیاسی دھڑے بندیوں نے اور کچھ اس قسم کے لاطائل مباحث نے فروعی اور غیر اصلی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں میں بے شمار فرقے پیدا کر دیئے تھے۔ معقولات والوں کا یہ حال تھا کہ وہ یونانی حکما کے مرید ہو گئے تھے اور ان کے ظنیات کو وحی الٰہی کا درجہ دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہم اہل عقل ہیں، لیکن تھے حقیقت میں وہ بھی اہل نقل۔ ان لوگوں نے ان ظنیات کو اسلام کے ساتھ ایسی آمیزش کی تھی کہ دودھ اور پانی کو الگ

کرنا محال ہو گیا تھا۔ متکلمین مناظرہ پسند تھے اور متقشفین ظاہر پرست۔ متکلمین کے ہاں بس قیل و قال تھی اور راسخ العقیدہ کہلانے والے علماء کے ہاں فقط ظاہر پرستی اور لفظ پرستی۔ دین کی روح نہ اس طبقہ میں تھی اور نہ اس طبقہ میں۔ روحانیت کے دعویدار، رہبانیت اور ترک دنیا پر مائل تھے، یا کم از کم اس کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کے ہاں نہ آفاق کا مشاہدہ تھا نہ تسخیر فطرت اور تقدیر ملت کی خواہش۔ تصوف ایک حیات گریز چیز بن گئی تھی۔ دنیا کا کوئی شعبہ قابل اعتنا نہ تھا۔ قرآن کی تعلیم یہ تھی کہ ظاہر بھی حق ہے اور باطن بھی حق۔ اول بھی حق ہے اور آخر بھی حق۔ خدا کی خلقت اور کائنات میں نہ بطلان ہے اور نہ فتور۔ لیکن دنیا کو ہیچ سمجھنے والوں نے اس کو دیوانے کا خواب بنا دیا تھا:

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

علم و حکمت کو قرآن کریم خیر کثیر کہتا ہے۔ لیکن صوفیوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ علم حجاب اکبر ہے۔ خدا وجود کو حقیقی کہتا ہے اور نعمت کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن صوفی کہتا تھا کہ تیرا وجود ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ صوفیاء کرام جو حقیقت آشنا تھے وہ بھی ان کلمات کو دہراتے تھے، لیکن ان کے ہاں ان کی لطیف تعبیریں تھیں، متصوفین کے ہاں ان تصورات نے فرار عن الحیات کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور غلط تصوف نے وجود کی بجائے عدم کی توصیف کو اپنا مسلک بنا لیا تھا:۔

صورتِ وہمی بہ ہستی متہم داریم ما
چوں حباب آئینہ بر طاقِ عدم داریم ما

تمام کائنات خدا کا خواب و خیال بن گئی تھی:۔

تا تو ہستی خدائے در خواب است
تو نہ مانی چرا دو شود بیدار

خدا جب تک خواب دیکھ رہا ہے یہ سیمیائی کائنات تب تک قائم معلوم ہوتی ہے۔ اگر کہیں وہ جاگ اٹھا تو بس:

عدمی عدم عدمی عدم زعدم چہ صرفہ بری عبث

اسلام کا مقصد تھا کہ دنیا میں اس طرح رہا جائے کہ دنیا دین بن جائے لیکن ترکِ علائق کی تعلیم نے یہ زور پکڑا کہ:

ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولیٰ ترکِ ترک

غرض کہ رومی کے زمانہ میں ملّا ظاہر پرست رہ گیا تھا اور فقیہ دفتر پرست۔ یہ گروہ دین کے مغز کو چھوڑ کر اس کی ہڈیاں چبا رہے تھے بلکہ ان ہڈیوں پر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے اسی صورت حال کے متعلق مولانا روم کا یہ مشہور شعر ہے کہ:

من ز قرآں برگزیدم مغز را
استخواں پیشِ سگاں انداختم

اب غور طلب بات یہ ہے کہ رومی اور اقبال کے زمانوں میں کس قسم کی مطابقت ہے اور ان دونوں نے اپنے اپنے زمانے کے احوال و افکار کی نسبت جو زاویہ نگاہ اختیار کیا اس میں کیا مماثلت ہے؟ رومی کے زمانہ میں ایک خاص قسم کے عقلی علوم کا چرچا تھا اور ایک خاص انداز کا فلسفہ جزوِ تعلیم بن گیا تھا۔

رومی کی مثنوی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تمام عقلی علوم سے کما حقہ واقف ہے اور ان سے واقف ہوتے ہوئے اور ان میں جس قدر حقیقت کا پہلو ہے اس کو اپناتے ہوئے بھی کسی محدود اور ظنی عقلیت کا شکار نہ تھا بلکہ ہر مسئلہ پر رومی غیر معمولی بصیرت اور غیر معمولی جرأت سے تنقید کرتا ہے۔ وہ عقل کو خدا کی ایک عظیم نعمت سمجھتا ہے اور حکمت کا دلدادہ ہے۔ لیکن اس کے ہاں عقل و حکمت کے دائرے بڑے وسیع ہیں۔ اس کی عقل صرف مادیات اور حسیات تک محدود نہیں وہ عقل کو صفاتِ اللہ کا ایک عالمگیر مظہر تصور کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

ہاں چہ دریا ہاست در پہنائے عقل

اس کے نظریۂ حیات میں مادے سے لے کر خدا تک زندگی ہی زندگی ہے۔ لیکن انتہائی پستی سے انتہائی بلندی تک اس کے بہت سے مدارج ہیں۔ ہر درجۂ حیات زندگی ہی کا ایک رجحان ہے اور جہاں

زندگی ہے وہاں کسی نہ کسی درجے کی عقل بھی ہے۔ چنانچہ عارفِ رومی عقلِ جمادی، عقلِ نباتی، عقلِ انسانی اور عقلِ نبوی کے مدارج کا ذکر کرتا ہے۔ خدائے حکیم کی خلقت اور مظاہر میں سے کوئی مظہر حکمت سے خالی نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جس درجے کا مظہر ہے اسی درجے کی عقل ہے۔

اقبال اور رومی کے ہاں بہت سے نظریات مشترک اور مماثل ملتے ہیں۔ اقبال کا نظریۂ خودی جو اقبال کے کمال کی وجہ سے اس کا اپنا بن گیا ہے اس کے بنیادی تصورات بھی رومی کے ہاں ملتے ہیں۔ عام صوفیا نے فنا اور ترک پر زور دیا عین دین بنا لیا تھا۔ رومی نے اس کو بقا کے نظریہ میں بدل دیا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ہر ترقی کے لئے پہلی حالت کو فنا کرنا پڑتا ہے لیکن مقصود بقا اور ارتقا ہے۔ رومی کے ہاں بھی خودی کا استحکام لازمی ہے اور اس کا طریقہ قوتِ تسخیر میں اضافہ کرنا ہے۔ عجمی تصوف نے ترکِ حاجات کو خدا رسی کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ رومی کہتا ہے نہیں حاجت تو مصدرِ وجود اور منبعِ بہبود ہے۔ ہاں یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ حاجات کہیں پست اور حیات کش نہ ہوں۔ زندگی کے تقاضے بلند ہونے چاہئیں۔ رومی کی تلقین اس بارے میں یہ ہے کہ:

پس بغیر احاجت اے محتاج زود

مثنوی میں اس مصرع کی تشریح میں مولانا روم لکھتے ہیں کہ خدا نے زمین و آسمان بھی عبث نہیں پیدا کئے بلکہ کسی حاجت ہی سے پیدا کئے ہیں:

اسی خیال کو اقبال طرح طرح سے اپنے فارسی اور اردو کلام میں ادا کرتا ہے:

زندگانی را بقا از مدعاست — کاروانش را درا از مدعاست

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست — فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست

از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا — سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا

اس کے بعد عقل کی آفرینش کا نظریہ اقبال کے ہاں ملتا ہے کہ عقلِ ندرت کوش و گردوں تاز بھی آرزو ہی کا اعجاز ہے اور عقل آرزو ہی کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔

اقبال اور رومی میں اور بھی کئی مشترک باتیں ہیں دونوں بقا پرست ہیں اور دونوں ارتقا پسند۔ مولانا فرماتے ہیں کہ تمام زندگی خدا ہی کی ذات سے سرزد ہوتی ہے اور تمام زندگی کا میلان خدا کی طرف رجعت ہے کیونکہ وجود کا اصل اصول یہ ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف عود کرتی ہے۔

کُلُّ شَيءٍ یَرجِعُ اِلیٰ اَصلِہٖ ،

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

اس رجعت الی اللہ میں ہر چیز اوپر کی طرف اٹھ رہی ہے۔ ہر وجود کے اندر صرف اپنے آپ کو قائم رکھنے ہی کا میلان نہیں ہے بلکہ اپنے مخفی ممکنات کو ظہور میں لانے کی مضطربانہ آرزو ہے۔ تمنائے رفتار سے پاؤں پیدا ہوتے ہیں اور تمنائے نوا سے منقار۔ چونکہ خدا کی ذات لامتناہی ہے اس لئے مرحلہ بھی کبھی طے نہیں ہو سکتا۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

قرآن کریم کہتا ہے کہ آفاق آدم کے لئے مسخر ہو سکتے ہیں اور اقبال اور رومی دونوں فقط آفاق کی تسخیر پر قناعت نہیں کرتے۔ عارف رومی کہتا ہے:

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید پیمبر شکار و یزداں گیر

اور اقبال اس کا ہمنوا ہو کر پکارتا ہے:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ